ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی

ایک مثالی شخصیت

مصنف

سید ازہر حسین ندوی

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

نام کتاب: ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی۔ایم مثالی شخصیت

مصنف : سید ازہر حسین ندوی

ایڈیشن : نومبر ۲۰۱۳ء

طباعت : کاکوری آفسیٹ پریس

پیش لفظ

۱۸۵۷ء میں سرزمین ہند پر سلطنت اسلامیہ کا پرشکوہ دور برطانوی استعمار کے بے رحم ہاتھوں سے ختم ہوا، اور پھر لال قلعے کے لال پردے کے پرزے اڑ گئے، پھر کیا تھا سرزمین ہند مغربی تہذیب وتمدن کی یلغار کی رزم گاہ بن گئی جس کے علمی، فکری، صنعتی انقلاب کے سامنے عالم اسلام کی چولیں ہلنے لگیں اور جس کے گندے جراثیم سے دنیا کے اکثر وبیشتر خطے کراہنے لگے، پھر کیا تھا ایک طرف برطانوی استعمار کی تلوار بے گناہ ہندوستانیوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی تو دوسری طرف ان کے متعفن اور ناپاک افکار وخیالات نے آنے والی نسلوں کے دل دماغ میں ایک طوفان برپا کر رکھا تھا، کالجز اور اسکولوں کے ذریعہ برطانوی سامراج مغربی تہذیب کو فروغ دے رہا تھا کہ باشندگان ہند کے دل ودماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم وفنون کے نقوش ثبت کر کے پورے طور پر ان کو غلامی کی منحوس زنجیر میں جکڑ دیا جائے، مغربی تعلیم کی اشاعت کے تئیں اس نے جو قدم اٹھایا یہ اس کے سامراجی نظام کی جڑوں کو مستحکم کرنے میں بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوا، تبھی تو اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس کی عیاری وچالاکی پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس خوفناک مرحلہ میں سرزمین ہند سے بیسویں صدی کے آغاز میں متعدد دانشوراور نابغۂ روزگار شخصیتیں منظرعام پر آئیں جنہوں نے مغرب کی یلغاراوراس کی تہذیبی ثقافتی اور علمی جنگ کا بھرپور مقابلہ کیا، اوراس کی خامیوں اورناکامیوں کا پردہ فاش کیا، اوران کی بیباک تحریروں نے مغرب کے قدیم وجدید کے خودساختہ تقسیم کا قلع قمع کردیا اوراس کی جنسی بے راہ روی، اخلاقی انارکی، خواتین کی بے پردگی، حقائق سے چشم پوشی اورتاریخی انحراف کا مدلل انداز میں جواب دیا، ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سرفہرست علامہ شبلیؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اکبر الہ آبادیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اورمولانا عبدالباری ندویؒ ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے اردو نثر ونظم کی راہ سے مغربی تہذیب وتمدن کی شناعتوں اوراس کے مضر وخطرناک پہلوؤں کو طشت ازبام کیا، اس کے گندے جراثیم سے آنے والی نسلوں کو بچانے کی تدبیریں کیں، اورفریب خوردہ مسلمانوں کی آنکھوں سے پردہ اٹھایا، تاہم سرزمین ہند سے عربی زبان کی راہ سے اگرکسی نے نہایت شدت کے ساتھ مغرب کی اساس پرحملہ کیااوراس کے بے حیا تمدن اورفلسفۂ مادیت پر بار بار تنقید کی ہے تو وہ صرف مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات گرامی ہے، آپ نے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" اور "الصراع بین الفکرة

الإسلامية والفكرة الغربية" کے ذریعے مغرب کی بے راہ روی اور اس کے باطل نظریات کا پردہ فاش کیا، اور ان دونوں کتابوں میں انتہائی فکر انگیز وطاقتور اسلوب نگارش کے ذریعے سارے اسلامی ملکوں کے سامنے یہ اجاگر کیا گیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل اسلام سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں یا مغربی تہذیب ونظریات سے جو اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں اور دنیا کی تہذیبی وثقافتی روایات کو ملیا میٹ کر کے انسانیت کے رشتے کو مادیت سے استوار کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

جس وقت شیخ ندوی کا اشہب قلم صفحۂ قرطاس پر دوڑنے کے لئے بے قرار تھا عین اسی وقت دوسری جنگ کا نقطۂ آغاز تھا، پہلی عالمی جنگ (1918) اپنی تمام تر ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ گذر چکی تھی، تحریک خلافت کا چراغ گل ہو چکا تھا، سلطنت عثمانیہ دم توڑ چکی تھی، مغربی تہذیب کے سامنے سب سے پہلے سجدہ ریز ہونے والی ترکی حکومت تھی جس کا سربراہ مصطفی کمال تھا، جس نے اپنے ملک کا تہذیبی، اخلاقی اور روحانی شیرازہ درہم برہم کر ڈالا تھا، ترکی کے نقش قدم پر عالم عرب کے دیگر نو آزاد ممالک چلنے کی کوشش کر رہے تھے ان ملکوں کے عوام اور ان کے حکمرانوں کے مابین مغربی تہذیب وتمدن نے ایک طوفان برپا کر رکھا تھا، بڑے بڑے تناور درخت اور علم وادب کی کوہ پیکر شخصیتیں اس طوفان میں پتے کی طرح اڑتی اور اس کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہتی نظر آتی تھیں، تیونس اور الجزائر اس کی کھلی مثالیں ہیں کہ مغربی تہذیب کی زہر آلود ہوا اور مسموم فضا نے ان ملکوں میں کیا کیا گل کھلائے اور اپنی جلوہ

سامانیوں کے ساتھ کتنوں کو الحاد اور لادینیت کے شکنجے میں جکڑ دیا، اور کتنے کو ارتداد کے راستے پر گامزن کر دیا۔

ایسے نازک مرحلے میں جہاں چہار جانب سے امت اسلامیہ کے سروں پر مصائب وآلام کی ننگی تلواریں لٹک رہی تھیں اور مسائل ومشکلات کی لامتناہی کھائی میں وہ سسکیاں لے رہی تھی، جب کہ دنیا کا ہر فرد مغربی تہذیب وتمدن کے قافلہ میں شامل ہونا اپنے لئے باعث فخر سمجھ رہا تھا، مفکر اسلام ؒ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے بیباک قلم سے امت کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیتے رہے جس کی بنیاد مغرب کے جھونکوں سے ہل رہی تھی اور اس کے درخت کی آبیاری کرتے رہے جس کی جڑوں کو قومیت واشتراکیت، عصبیت ولادینیت کی دیمک لگ چکی تھی، مغرب کے ایوانوں پر تیشے چلاتے رہے، اس کے غلط افکار ونظریات پر کھلے عام تنقید کرتے رہے صرف اسی پر اکتفا نہ کر کے آپ نے اپنی آغوش میں ارباب قلم کا ایک ایسا تازہ دم لشکر بھی تیار کیا جن کی نگاہیں جلوۂ دانش فرنگ سے خیرہ نہ ہوسکیں، اور جن کا طاقتور وبیباک قلم حق وصداقت کا آوازہ وہ کل بھی بلند کرتا رہا اور آج بھی وہ پاکیزہ گروہ اپنے محسن کی دکھائی ہوئی ڈگر پر پوری صلابت واستقامت سے قائم ودائم ہے اور حق وباطل کی رزم گاہ میں ان کا دست راست ہے، ان ارباب قلم میں ہر ایک دین کا نڈر سپاہی اور میدان صحافت کا بہترین شہسوار ہے، ان کی جرأت وبیباکی اخلاص ومروت اور ذکاوت وذہانت نے ان کے قلم کو تلواروں کی صفت عطا کر دی، ان کی

تحریروں میں صلابت وپختگی کیف وسرور انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کے نوک قلم کی تیزی اور بے باکانہ طرز تحریر دلوں پر ضرب لگاتی ہوئی اور میدان فکر وعمل کی طرف للکارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ان کی تحریریں حقائق زندگی، مقصد حیات، فکر ونظر کی بلندی اور عزائم وولولے کی گرمی سے پر ہے، جس میں زیست کا نور وسرور بھی ہے اور حرارت وتوانائی بھی، ان ارباب قلم کی سرفہرست سید محمد الحسنی مرحوم، حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی ذات گرامی ہے۔ اول الذکر سید محمد الحسنی کو کون نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنے بیباک قلم کے ذریعہ مصر وشام اور لبنان وعراق کے ایوانوں کے اندر ایک طوفان برپا کردیا وہاں کے مسلم نوجوانوں کے دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرمادی، ان میں اسلام کی فدائیت کا جذبہ پیدا کردیا، قومیت عربیہ کو بے نقاب کرنے والا کون تھا؟ اشتراکیت کی جڑوں کو کس نے کھوکھلا کیا؟ عالم عربی کی نئی نسلوں میں اسلام اور محمد عربیؐ کی روح پھونکنے والا کون تھا؟ "البعث الإسلامی" کے اداریے گواہ ہیں کہ وہ محمد الحسنی مرحوم کی ہی ذات گرامی تھی

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

جہاں تک حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی برکاتہم کا تعلق ہے (خدا آپ کی عمر دراز فرمائے) شیخ ندویؒ کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے، فی الوقت

ایک طرف آپ قافلہ ندوۃ العلماء کے روح رواں اور میر کارواں ہیں تو دوسری طرف ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی قیادت بھی آپ ہی کے دوش پر ہے ان سب ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آپ کے اشہب قلم نے بھی بہت سے معرکوں کو سر کیا ہے۔ "الأدب الإسلامی" کی ترویج واشاعت میں آپ کا لہو شامل ہے، "الرائد" کی راہ سے بہت سے باطل نظریات اور غلط تحریکات کی دھجیاں بکھیری ہیں، عربی واردو تصنیفات کے میدان میں آپ کا ایک طرۂ امتیاز ہے۔

اور آپ کے برادر خورد سید محمد واضح رشید حسنی ندوی حفظہ اللہ تو اپنی مثال آپ ہیں، آپ فی الوقت ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم اور "الرائد" کے ایڈیٹر ہیں، موصوف نے "البعث الإسلامی" میں "صور وأوضاع" کے کالم کے ذریعہ ہمیشہ مغرب اور مغرب کے افکار ونظریات اور اس کی لشکری اور فکری فوج کشی کو بے نقاب کیا ہے، آپ کا بیباک قلم کفر والحاد، صہونیت وماسونیت اور مغربی استعمار کے خطرات سے ہمیشہ عالم اسلام کو آگاہ کرتا رہتا ہے، آپ کم سخن لیکن وسیع النظر عالم ہیں، آپ کی مثال اس سمندر کی سی ہے جس کی اوپری سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، خاک کو ذرہ اور ذرہ کو آفتاب بنانا آپ کا خاص وصف ہے، مردم سازی اور ذہن سازی آپ کا طرۂ امتیاز ہے، خدا آپ کے سایۂ عاطفت کو تادیر برقرار رکھے۔

رہی بات حضرت الاستاذ ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی کی جن کے کاندھوں پر ندوۃ العلماء کے اہتمام کی ذمہ داری ہے اور ساتھ ہی "البعث الإسلامی" کی ادارت بھی، ہم ان کے سلسلہ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ہیں کیونکہ یہ مختصر سا کتابچہ انہیں کی خدمات کو اجاگر کرتا ہے، اگرچہ آپ کی خدمات پر مکمل روشنی ہرگز نہیں ڈال سکتا کیوں کہ دریا کو کوزہ میں کیسے سمیٹا جاسکتا ہے، اس کے لئے تو ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، صرف بعض احباب کے اصرار پر اس کو مرتب کر رہا ہوں تا کہ اسلاف کی زندگیوں سے آنے والی نسلیں اپنے روشن مستقبل کی راہیں نکالیں اور ان کی بنائی ہوئی راہوں پر تابناک مستقبل تلاش کریں۔

اگر اس موقع پر میں اپنے مخلص ومحترم استاذ جناب مرزا محمد احمد بیگ صاحب ندوی استاذ عربی ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ذکر نہ کروں تو بڑی ناقدری کی بات ہوگی جن کے چشمۂ علم وادب سے راقم سطور ایک عرصہ سے سیراب ہو رہا ہے جنہوں نے ہر موقع پر اس کی علمی اور فکری اصلاح کی ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ راقم سطور نے انہی کے زیر تربیت قلم پکڑنا سیکھا ہے اور انہی کی ہمت افزائیوں کے سہارے ترتیب وتالیف کے پرخطر میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کی ہے، موصوف کا ایک قیمتی اور تاریخی مضمون جو انہوں نے حضرۃ الاستاذ پر لکھا ہے اس کتابچہ میں شامل ہے جو کتابچہ کی اہمیت وافادیت کو بڑھا

رہا ہے۔

قارئین کی خدمت میں یہ کتابچہ پیش ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی کو بے جا ستائش کی بو محسوس ہو، تو یہ نظر نظر کی اور ذوق وظرف کی بات ہے، خدا سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر سی کاوش کو قبول فرمائے کیونکہ میں نے اس کے ایک مؤمن بندے کے محاسن کو اپنی بے بضاعتی کے باوجود اجاگر کرنے کی کوشش اس لئے کی ہے کہ اس کے محاسن کی آنچ سے ہمارے دلو میں حرارت پیدا ہو۔

تقبل الله منا وسدد خطانا وصلى الله على سيدنا وعلى آله وصحبه أجمعين۔

سید ازہر حسین ندوی

ہندوستان میں عربی صحافت کا خورشید جہاں تاب

(ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی)

صوبہ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں سے ضلع اعظم گڑھ اپنی مردم خیزی اور نابغۂ روزگار شخصیتوں کے حوالے سے ہندوستان کی اسلامی، علمی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا، اعظم گڑھ کے بعض قصبات جیسے گوسی، مبارک پور، چریا کوٹ اور مئوناتھ بھنجن وہ قصبات ہیں جو ماضی میں علم وفن کا گہوارہ تھے، اعظم گڑھ اور چریا کوٹ کے بیچ میں مئوناتھ بھنجن واقع ہے، جس کا حوالہ اعظم گڑھ کے راجاؤں کے شاہی فرمان میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ قصہ شہزادی جہاں آراء بیگم بنت شاہ جہاں تیموری کی جاگیر میں تھا اس لئے اس کا شاہی نام جہان آباد رکھا گیا تھا، شہزادی نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی اور یہ مسجد کیا تھی بلکہ یہاں درس وتدریس کی مسندیں بچھی ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے چاروں طرف طلبہ کے لئے حجرے تھے، اس قصبہ نے کپڑے کی صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ علم وفن کی گرانقدر خدمت بھی انجام دی، قدیم شاہی مسجد میں اب بھی ایک مدرسہ مفتاح العلوم قائم ہے، اس قصبہ میں

کثرت سے علماء پیدا ہوئے، اور اب بھی ایسے نامور علماء اس سرزمین کی کوکھ میں پرورش پا رہے ہیں، عرب وعجم میں جن کی شہرت کی بادِ نسیم چل رہی ہے، فضائیں ان کے علم وفن اور جوہر کمال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اپنی آغوش کھولے ہوئے ہیں، یہ قصبہ مئو جواب ایک مستقل ضلع کی حیثیت سے معروف ومشہور ہے، ماضی میں ضلع اعظم گڑھ کا ایک کثیر آبادی والا مسلم قصبہ تھا، اس قصبہ کی تاریخ بڑی قدیم ہے، اور ہمیشہ یہ علماء اور ماہرین فن کا مرکز رہا ہے، اور اس کے گوشہ گوشہ میں علم وفن کے آسمان پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور یہی وہ سرزمین ہے جس نے زبدۃ المحدثین حبیب الرحمن اعظمی کو اپنی آغوش میں پالا، اور یہاں کے دانش کدوں نے ہزاروں تشنگان علم کو علم کا آب حیاب پلایا۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

یادش بخیر! اس مرکز علم وفن کی مشک بار فضا میں ایک علمی خانوادے کے اندر ۱۴ / ۱۹۳۴ء میں علم وادب کا ایک اختر نیک فرجام طلوع ہوا، جو پہلے کوکب تاباں میں ڈھلا پھر مہر درخشاں بن کر افق پر چھا گیا، آج اس کو دنیائے علم وادب ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی (حفظہ اللہ) کے پاکیزہ نام سے جانتی ہے، کیسی مبارک ساعت تھی وہ جب علم وتقویٰ کے زیور سے آراستہ ماں باپ

نے سعید نام رکھا اور زندگی کے آنے والے لمحوں نے حرف بہ حرف یہ ثابت کر دیا کہ حضرت سعید کے سر پر تاج سعادت زندگی کے ہر دور میں سجا رہا، اور نہال و مالا مال تو وہ ہو گئے جن پر ان کا فیضان نظر ہو گیا ۔

کیا نظر تھی کہ جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

ڈاکٹر صاحب نے جس گھرانہ میں آنکھیں کھولیں وہ علم و معرفت کا مذاق آشنا تھا، آپ کے والد نامدار حضرت مولانا ایوب صاحبؒ بڑے جید عالم اور فن حدیث کے ماہر تھے، زندگی بھر علم کے دامن سے وابستہ رہے اور یہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا رہا، مفتاح العلوم مئو میں بحیثیت ناظم اعلیٰ ایک عرصہ تک رہنے کے بعد شیخ الحدیث کی حیثیت اختیار کر لی ۔ ۱۹۶۲ء میں ڈابھیل (گجرات) کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر ایک طویل عرصہ تک جلوہ افروز رہے، اور اپنے تدریسی فرائض کو تا حیات انجام دیتے رہے اور ہزاروں کی تعداد نے ان سے کسب فیض کیا، مولاناؒ نے اپنے سبھی بچوں کو علم کے موتی سے دامن حیات کو بھرنے کا ہنر سکھایا، اور ایں خانہ ہمہ آفتاب است کی صورت نمود پذیر ہوئی، ہمارے ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی، کیونکہ آپ کا گھر کسی مدرسہ سے کم نہیں تھا، ہر آن علم کی گفتگو اور علم کا چرچا رہتا تھا، پھر آپ نے اپنے قصبہ کی شاہی مسجد میں قائم مدرسہ مفتاح العلوم میں کئی سال تک

رہ کر اپنی علمی تشنگی بجھائی اور عالمیت کی سند حاصل کی، لیکن ۱۹۵۲ء میں اقبال کا یہ شعر ہونٹوں پر سجائے ہوئے لکھنؤ میں عالمگیر شہرت کے حامل دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا ؎

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ کی باقاعدہ مدت تعلیم صرف دو سال ہے جہاں سے آپ ۱۹۵۴ء کے اوائل میں تخصص فی الأدب العربی کی سند امتیازی نمبرات سے حاصل کی، اور یہ حقیقت ہے کہ جس کا ستارہ اقبال بلند ہوتا ہے، ماحول کی ہر چیز اس کی رفیق بن جاتی ہے، ندوۃ العلماء میں آپ کو ایسے لائق وفائق ماہر اساتذہ نصیب ہوئے جو عام طور پر لوگوں کو کم نصیب ہوتے ہیں، ان اساتذہ میں میر کارواں کی حیثیت حضرت مولانا علی میاںؒ کی تھی جن کے خرمن علم وادب اور فکر ونظر سے آپ نے جی بھر کر خوشہ چینی کی اور عربی زبان وادب میں وہ کمال بہم پہونچایا کہ اس جوہر کمال نے آپ کے سر پر عظمت کا وہ تاج سجایا کہ جس کی جلوہ طرازیوں نے عربی زبان وادب کے ذخیرہ کو چمکایا باوجود اس کے کہ اوائل عمر ہی میں آپ کو عربی زبان میں مہارت وقدرت حاصل ہوگئی تھی، مگر امام عرب وعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی سرپرستی میں خوب

سے خوب تر کی تلاش کا شوق بے اختیار سن ۱۹۵۸ء میں آپ کو عروس علم بغداد کی سرزمین پر شیخ علامہ ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی مراکشی کے در علم لے جاتا ہے اور گیارہ مہینے ان کے فیضان علم وادب میں رہ کر آپ نے اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشی اور آپ کی زبان وادب میں چار چاند لگ گئے، اسی کا نام ہے جہد مسلسل اور محنت پیہم جس کے بغیر دنیا میں انسان کو نہ تو عظمت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی دلوں میں آفاق گیری کے ولولے اٹھتے ہیں یہی انداز آفاق ہے کہ جب اس کی کرن کسی انسان کی زندگی میں پھوٹتی ہے تو اس کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے ؎

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

مولانا کے کارناموں کی ایک حسین دنیا ہے جو کہکشاں کی مانند جگمگا رہی ہے، عربی صحافت کا میدان ہو، تصنیف وتالیف کی دنیا ہو، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی کے فرائض اور اہم عہدوں کو بحسن وخوبی انجام دینے کی بات ہو، اندرون ہند ودیگر اسلامی ممالک کے دعوتی واسلامی اسفار ہوں، انگلرل یونیورسٹی کے تئیں آپ کی مخلصانہ جدوجہد کی داستان ہو، ہندوستان کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کے تعاون اور ان کی ترقی کے لئے سفارشات

اور توصیات لکھنے کا معاملہ ہو یہ اور اس کے علاوہ بہت سے ایسے نمایاں پہلو ہیں جو الگ الگ عنوان کے تحت لکھے جانے کے متقاضی ہیں ۔

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

میں اپنے اس مختصر مضمون میں حتی الامکان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا، سب سے پہلے میں مولانا کی صحافتی زندگی کے خط وخال کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر نظر رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں سرزمین ہند پر اسلام کی آمد کے جلو میں عربی زبان نے بھی کروٹیں لی، اور پھر اسلامی حکومتوں کے سایہ میں عربی زبان عہد بعہد ہندوستان کے علماء کی دلچسپی وتوجہ کا مرکز بنی رہی لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ بعض سیاسی وجغرافیائی اسباب کی بنا پر باوجود اس کے کہ ہندوستان میں آٹھ سو سال سے زیادہ مسلمانوں کی حکومت رہی، عربی زبان یہاں کی سرکاری زبان نہ بن سکی، البتہ علماء تصنیف وتالیف کے لئے اس زبان کو اختیار کرتے رہے، اور وہ بھی بہت محدود پیمانے پر۔

انیسویں صدی کے اخیر میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پیش نظر جہاں بہت سے اہم مقاصد تھے ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ عربی

زبان کو بحیثیت ایک زندہ زبان کے ہندوستان میں رائج کیا جائے، بحمداللہ ندوۃ العلماء اپنے اس مقصد میں سو فیصد کامیاب ہوا، اور ندوۃ العلماء کے فضلاء وفارغین نے ہندو بیرون ہند میں عربی زبان وادب کی جو ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں کوئی بھی حقیقت پسند ان سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے نہ صرف عربی زبان کی تعلیم کی طرف توجہ دی بلکہ عربی صحافت کی شاندار روایت قائم کرکے ہندوستان کی پیشانی پر عربی زبان کی خدمت کا لازوال نقش ثبت کردیا جو بقائے عربی زبان باقی رہے گا، میر کارواں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنے عربی لٹریچر کے حوالے سے پوری دنیا میں مشہور ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان کی آغوش میں پلنے والے چند ایسے ارباب قلم بھی ہیں جن کا قلم نصف صدی سے عزم وحوصلے سے بھرپور تازہ دم مجاہد کی طرح اسلام مخالف افکار ونظریات کے تار وپود بکھیر نے اور اس کے کھوکھلے پن کو ثابت کرنے میں پورے بانکپن وتوانائی کے ساتھ مصروف ہے، انہیں بخت آور ارباب قلم میں سے حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی (حفظہ اللہ) کی ذات گرامی بھی ہے۔ بلا مبالغہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے چند حضرات کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں کوئی ایک بھی ایسا فرد نہیں ہوگا کہ جس کا اشہب قلم آہنی عزائم کے ساتھ عربی صحافت کی شاہ راہ پر

نصف صدی سے بغیر کسی تکان کے رواں دواں ہو، واہ ری ہمت!

مولانا نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ گھرانہ اسلامی غیرت، دینی حمیت کا ایک نمونہ تھا، اسی دینی غیرت کا ظہور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے ہوتا ہے، بالخصوص صحافت کا میدان نہایت نازک اور کانٹوں سے گھرا ہوتا ہے، قدم قدم پر اس وادی میں لوگ اپنے اصول ونظریے کو نیلام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور اپنے شخصی مفادات کے بت پر قومی اور ملی تیغ بے نیام کی طرح باطل افکار ونظریات کی گردن کو اڑاتا رہا، یہ بھی زندہ حقیقت ہے کہ سچائی، ایمانداری اور علم کی خوشبو صالح مقصد رکھنے والے قلم کی انگلیوں سے پھوٹنے لگتی ہے، آپ کی عربی صحافت کا آغاز ماہنامہ مجلہ ''البعث الاسلامی'' سے ہوا جو ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ترجمان بن کر ہندوستان کے مطلع صحافت پر طلوع ہوا، اس کے پہلے شمارہ ہی سے آپ اس کے قلم کاروں میں شامل ہوئے اور اس مجلّے کے پہلے ایڈیٹر استاذ محمد الحسنی کے اسسٹینٹ کی حیثیت سے جڑے ہے ۱۹۷۸ء میں جب استاذ محمد الحسنی اللہ کو پیارے ہو گئے تو آپ نے باقاعدہ اس کی ادارت سنبھالی جو آج تک پورے آب وتاب کے ساتھ جارہی ہے، اسی طرح ۱۹۵۹ء میں جب پندرہ روزہ ''الرائد'' منظر عام پر آیا تو اس میں بھی نائب الرئیس کی حیثیت سے آپ نے قلمی تعاون کیا۔ ماہنامہ

مجلہ ''البعث ال اِسلامی'' اور پندرہ روزہ ''الرائد'' ہندوستان کی عربی صحافت میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، بالخصوص ''البعث ال اِسلامی'' نے وقت کے بڑے بڑے فرعونوں کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا اور بڑے بڑے کج کلاہوں کے اسلام مخالف منصوبوں کو تار عنکبوت کی طرح مسل ڈالا، اور فرزندان اسلام کے سینوں کو غیرت اسلامی کے شعلوں سے بھڑکا دیا، یاد کیجئے مصر کی سرزمین کو جہاں عربی قومیت کا بت تراشا گیا اور حکومت کی پوری مشنری نے پوری اسلامی قوم کو اس بت کے آگے ناصیہ فرسائی پر مجبور کیا، بظاہر یہ ایسا رواں تھا کہ جس کی موج بلاخیز میں قریب کے آشانہ پر ایسا تیشہ چلایا کہ عربی قومیت کا بت خود عربوں کی نگاہوں میں بے آبرو ہو کر رہ گیا، اور ان کے دلوں میں اس کے خلاف شدید نفرت کی آندھی چلنے لگی، اس میدان میں جہاں فقید الدعوۃ ال اِسلامیہ الاستاذ محمد الحسنیؒ کا طاقتور قلم اپنا جوبن دکھا رہا تھا وہیں مولانا محترم بھی اسلام کے ایک سچے سپوت کی طرح مورچہ سنبھالے رہے، یہ تو ایک واقعہ ہے جسے مشتے نمونہ از خروار کے طور پیش کیا گیا ہے مجموعی طور پر مجلہ ''البعث ال اِسلامی'' کی خدمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو فکر اسلامی کی ترویج کے اعتبار سے اور زبان و ادب کی خدمت کے پہلو سے دونوں حیثیتوں سے میں سمجھتا ہوں کہ عالم اسلام کی عربی صحافت سے ہمارا یہ مجلہ آنکھیں ملاتا ہوا نظر آئے گا۔ ان

دونوں پرچوں کے صفحات سچے گواہ ہیں کہ ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی (حفظہ اللہ) کے رشحات قلم نے فکر اسلامی کی ترویج وآبیاری میں زبردست حصہ لیا ہے، اور آپ کا قلم چاہے جس موضوع کی نقش گری کر رہا ہو مگر صفحۂ قرطاس پر تیار ہونے والا مرقع روح اسلامی کی بابش سے منور ہوتا ہے، آپ کی کوئی تحریر ایسی نہیں ہوگی جو اسلامی شعائر واقدار کے کسی پہلو کو اجاگر نہ کرتی ہو۔

دونوں پرچوں کے مضامین کا اگر حساب لگایا جائے تو ہزاروں مضامین سے زیادہ کا تناسب نکلے گا اور اگر موضوعات کے اعتبار سے ان کو اکٹھا کیا جائے تو بلا مبالغہ دسیوں جلدیں تیار ہو جائیں گی، آپ نے عربی صحافت کے معیار ووقار کو بلند کیا اور ایسا اسلوب نگارش اختیار کیا جو صحافت سے زیادہ ادبی اسلوب سے قریب ہے، بالفاظ دیگر ایسا اسلوب جو ہمیشہ تر وتازہ اور بالیدہ رہنے والا ہے، ورنہ عام طور پر صحافتی اسلوب وقتی ضرورت کی تکمیل تو کرتا ہے مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس اسلوب پر اوس پڑ جاتی ہے مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب کے انداز نگارش تک خزاں کے سفاک ہاتھ کبھی نہیں پہنچ پائیں گے۔

عربی صحافت کے دوش بدوش آپ نے اردو صحافت کی وادی میں بھی ایک ماہر صحافی کی حیثیت سے قدم رکھا اور اردو صحافت کے دامن کو اپنے رشحات قلم سے مالا مال کیا، ''تعمیر حیات'' کے صفحات، اور ''ندائے ملت'' کے اوراق پر

تاج محل کی طرح جاندار اور خوبصورت تحریریں اس بات پر غماز ہیں کہ اگر آپ مستقل طور پر اس میدان میں جمے رہتے تو ہندوستان کی اردو صحافت کی تاریخ میں آپ ایک عہد کی تاریخ کے بانی ہوتے ،ڈاکٹر منظور عالم صاحب آپ کی اردو خدمات کے سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں:

"اہل علم کی رائے میں مولانا اگر چہ عربی کے بلند پایہ ادیب وصحافی اور مایہ ناز قلم کار ہیں جن کی تحریروں نے عالم عرب کے اعلی تعلیم یافتہ سے عربی زبان وادب کے میدان میں اپنی عبقریت کا لوہا منوایا ہے اور عرب ممالک کے علماء مفکرین، اسلامی تحریکوں کے قائدین وکارکنان مولانا کی تحریروں اور مولانا کی زیر ادارت شائع ہونے والا ماہنامہ **"البعث الاسلامی"** سے خود بھی روشنی حاصل کرتے ہیں اور ان کو پھیلانے اور عام کرنے کی ہر ممکن کوشش بھی کرتے ہیں، تاہم پیش نظر مجموعہ مضامین سے مؤلف کی اردو زبان وادب پر دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، بلاغت، زور بیان، تاثیر، سلاست، دل میں اتر جانے کا وصف ان کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔

مولانا کی تحریر کی ایک خوبی یہ ہے کہ سخت ترین حالات اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی مولانا امید کی کرن اور روشنی کی چمک دیکھ لیتے ہیں، اور کہیں مایوس نظر نہیں آتے ، بلکہ مخالف حالات میں بھی دھارے کو بدل ڈالنے اور

طوفان کا رخ پلٹ دینے کی دعوت دیتے ہیں، قرآن کریم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال مولانا کے زور قلم میں چار چاند لگا دیتا ہے۔" / پیش لفظ اسلام اور مغرب - از ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی۔

تاہم اردو صحافت کے حوالے سے آپ کی جو خدمات ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ یہ تو بات ہوئی صحافت کی۔ آیئے! اب جائزہ لیتے ہیں دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا کی تدریسی خدمات کا ۱۹۵۴ء میں فراغت کے بعد ہی عربی زبان وادب کے مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا اور بڑے بڑے عہدوں اور کثرت اسفار کے باوجود اس طویل عہد میں تدریسی فرائض کو پورے اہتمام کے ساتھ انجام دیا اور آج بھی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود سلسلہ جاری ہے گویا ان کا ذوق ومزاج بن گیا ہے، حیرت تو اس پر ہوتی کہ مولانا متنوع مصروفیتوں کے باوجود ساری ذمہ داریاں بڑے سلیقہ کے ساتھ نبھاتے ہیں، بہت سے لوگ ایک ہی ذمہ داری کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پاتے، چہ جائے کہ مختلف طرح کے بوجھوں کو وہ اٹھا سکیں، جنوری ۲۰۰۰ء سے مولانا ندوۃ العلماء کے منصب اہتمام پر فائز ہیں، اس سے پہلے ۱۹۹۱ء میں آپ دار العلوم ندوۃ العلماء کے مشرف اداری بنائے گئے، دو سال تین ماہ اس منصب پر آپ فائز رہے، اور ۱۹۹۳ء میں آپ نے عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا کے عہد کو

زینت بخشی، جس پر ۱۹۹۹ء کے اخیر تک آپ منصب پر رہے، ان تمام ذمہ داریوں کو آپ نے مؤمنانہ شعور اور احتساب نفس کے ساتھ انجام دیا، اور ادھر ۲۰۰۰ء سے آپ اہتمام کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کتنا نازک اور الجھا دینے والا یہ کام ہے مگر مولانا کے جو علمی معمولات تھے ان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ ''البعث الی اسلامی'' کا اداریہ تحریر کرنا اور پورے پرچہ کی تیاری، پرچہ کا وقت پر نکلنا یہ غیر معمولی بات ہے، پابندی، کے ساتھ ''الرائد'' کے ہر شمارہ کے لئے ''کلمۃ الرائد'' کا سپرد قلم کرنا، تدریس کی ذمہ داریاں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مسجد کی امامت وخطابت اور آئے دن مختلف علمی ودعوتی اسفار اور صبح سے شام تک پچاسوں ملاقاتیوں کو وقت دینا، اور طلبہ کے مسائل کو سننا اور حل کرنا ان کی علمی ترقی کے لئے حکمت کے ساتھ تدبیریں اختیار کرنا، عربی، بزموں کو فعال بنانے کے لئے فکر مند رہنا، اللہ اکبر!! یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ سارے کام وہی انجام دے سکتا ہے جو عبقری ذہن اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہو، اور جس کی کتاب زندگی کا سرنامہ استقامت ہو، مولانا کا مزاج خالص داعیانہ ومربیانہ ہے، اور اخلاص وایثار تو آپ کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے، مولانا کی عالی ظرفی وبلند نگہی کا عالم یہ ہے کہ خیر کے چھوٹے سے چھوٹے کام کی تحسین سے نہیں تھکتے، عمر کی 76 رویں سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بھی نہ ان کے

ارادوں میں لچک دکھائی دیتی ہے نہ چہرہ پہ تھکن کے آثار، عزائم کی تلوار آج بھی اسی طرح تیز ہے جس طرح جوانی کے ایام میں تھی، یہ امنگ اور ولولہ ہی ہے جس نے آپ کے کارناموں کو گونا گوں بنادیا ہے۔

تاریخ ساز وعہد آفریں شخصیتوں کے کارناموں کی دنیا بڑی وسیع ہوتی ہے، کسی بھی تاریخ ساز شخصیت کی سیرت اٹھا کر دیکھئے وہ آپ کو ایک ایک دائرے میں محدود وسمٹا ہوا نہیں نظر آئے گا بلکہ اس کی فکر ونظر کے اجالے دور دور تک روشنی کا مینار قائم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح مولانا کے کارناموں کی اقلیم بڑی کشادہ ہے، ایک طرف تو ندوۃ العلماء کے لئے سراپا پانیاز زندگی ہر سانس میں ندوۃ العلماء کی ترقی کے ساز کی جھنکار، ہر ہر قدم میں اگر خوشبو ہے تو اس مرکز علم کی، نگاہوں میں اگر کوئی سودا ہے تو اس گہوارۂ علم وفن کا، جان کی بازی لگادینے کا جذبہ، تمام ارمانوں کو بھینٹ چڑھادینے کا حوصلہ، اپنے مادر علمی سے ایسا لگاؤ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے، اور اجرت سے زیادہ کام کرنے کی للک انہیں لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہے، جن کو اپنے ادارہ اور مشن سے عشق ہو، مولانا اس اعتبار سے بہت چوٹی پر نظر آتے ہیں، دوسری جانب عصری تعلیم گاہوں سے قائدانہ ربط، اور ملت کے لئے ان کی ضرورت کا شدید احساس، اور مولانا کا یہی وہ پختہ اسلامی شعور اور عصری

تقاضوں کا احساس ہے کہ جس نے آپ کو انٹیگرل یونیورسٹی کے لئے دامے درمے قدمے سخنے قربانی دینے پر آمادہ کیا، اس یونیورسٹی کی تعمیر وترقی میں مولانا کا خون جگر شامل ہے، اس کی حنا بندی اور لالہ کاری میں آپ کی متاع حیات کی خوشبو کی آمیزش ہے، اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور ایک اقلیتی ادارہ کی منزل تک پہونچانے میں آپ کی شرکت ناقابل فراموش ہے، یہی وجہ ہے کہ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر وسیم اختر صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ اس یونیورسٹی کے تعلق سے مولانا کی قربانیاں بے لوث ہیں، جو ایک سچے اور بے لوث خادم قوم کی سب سے نمایاں نشانی ہوتی ہے، مولانا واقعتا ایک خادم قوم ملت ہیں، اس یونیورسٹی کے قیام کے دن سے آج تک برابر اس یونیورسٹی پر مولانا کی ذرہ نوازیوں کا ابر موتی برسا رہا ہے، مولانا اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہیں، اور ہر لحظہ اس کی ترقی کے لئے کوشاں بھی رہتے ہیں۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے دوش بدوش آپ کے علمی اور دعوتی اسفار کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو بیشتر اسلامی ممالک پر پھیلا ہوا ہے، ان ممالک کی طویل فہرست ہے یہاں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ جیسے عراق، امارات، قطر، سعودیہ عربیہ، کویت، عمان، پاکستان، سنگاپور، بنگلہ دیش، اور پھر بالخصوص آپ کا مصر کا

سفر جو ۱۹۷۷ء میں ہوا، قابل ذکر ہے جس میں آپ شیخ الأزہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی دعوت پر ازہر کے مہمان کی حیثیت سے استفادۂ علمی کے لئے تشریف لے گئے، اس کے علاوہ بار بار آپ اندرون ہند اور بیرون ہند مختلف علمی وادبی کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں، اور جب رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے ایک فعال ممبر کی حیثیت سے اس نظریہ کی ترویج واشاعت کے لئے اپنے بے باک قلم کا بڑی جرأت مندی کے ساتھ استعمال کیا، اور اپنی طاقتور نگارشات کے ذریعہ اس فکر کو لوگوں کے ذہن ودماغ میں راسخ کرنے کی کوشش کی، اور اباحی ادب کے سیل رواں کو اپنی تحریروں کی چٹان کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی، ۲۰۰۰ء میں آپ اتر پردیش کی دینی تعلیمی کونسل کے نائب صدر اعزازی عہدے کی پیشکش کا بھی انکار نہیں کر سکے کہ وہ محض ایک دینی تعلیمی ذمہ داری ہے، اور اسلامیان ہند کیلئے ایک بنیادی مسئلہ ہے، ہندوستان، نیپال، اور دیگر ملکوں میں مختلف مدارس اور دیگر اسلامی تحریکوں کو آپ کی سرپرستی حاصل ہے۔

صحافتی میدان میں پورے انہماک کے پہلو بہ پہلو آپ کے قلم گوہر بار سے مستقل کتابیں بھی عربی اور اردو میں منصۂ شہود پر آئیں۔

عربی میں آپ کی تصنیفات یہ ہیں: "ساعة العارفین" جو روحانی

پیشواؤں کے تذکرے پر مشتمل ہے، جس میں ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ان ہدایت کے میناروں نے اپنے اپنے دور میں کس طرح سماج کے اندر اصلاح وتجدید کے کارنامے انجام دیئے۔ ''شعراء الرسول فی ضوء الواقع والقریض'' یہ کتاب آپ کی پی۔ایچ۔ڈی۔کا مقالہ ہے جس پر ندوۃ العلماء کے ساتھ کئی یونیورسٹیوں نے ۱۹۹۲ء میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی، یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور البیلی کتاب ہے، اس میں ان سخنوروں کا تذکرہ ہے جو دامن رسالت مآب ﷺ سے وابستہ تھے، اور پرورش لوح وقلم کرنے کے بجائے پرورش عقیدہ توحید کرتے رہے، اور جن کے فن پاروں نے چمن اسلام کی آبیاری کی، تیسری کتاب، ''احمد بن عرفان الشهید'' ہے یہ کتاب انیسویں صدی کے اس مرد مجاہد کی مومنانہ داستان ہے جس کی آنکھوں میں سرزمین ہند پر خلافت اسلامیہ کے قیام کا خواب مچل رہا تھا، اس کے علاوہ ''ندوة العلماء تواجه التحدی الکبیر'' محدث الهند الکبیر حبیب الرحمن الأعظمیؒ ہے۔ اور ایک کتاب ''الأدب وال إسلام'' کے نام سے بھی ہے جو زیر طبع ہے۔

اردو میں آپ کی تصنیفات یہ ہیں:

علم التصریف، اسوۂ حسنہ کے آئینہ میں، اسلام اجتماعیت اور اس کا

ادب، تذکرہ اہل دل، اس کے علاوہ آپ نے بعض اہم اردو کتابوں کو عربی کا جامہ پہنایا، جو مندرجہ ذیل ہے، "الحافظ ابن تیمیة" جو مولانا علی میاںؒ کی تصنیف، تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم کا ترجمہ ہے، "القرن الخامس عشر" جو پندرہویں صدی ہجری کا ترجمہ ہے، مولانا علی میاںؒ کی کتابوں کے علاوہ آپ نے مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا جس کا نام "توزیع الثروة فی الإسلام" ہے اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب کا "المنهج فی الدعوة والإسلام" کے نام سے ترجمہ کیا، اور مولانا منظور نعمانی صاحب کی کتاب "القرآن یتحدث إلیکم" کے نام سے آپ نے ترجمہ کیا، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کی بھی ایک کتاب کو آپ نے عربی کے قالب میں ڈھالا، جس کا نام "أسباب سعادة المسلمین وشقائهم" ہے۔

عربی زبان وادب کے حوالہ سے آپ کی جو گرانقدر خدمات ہیں اس کا اعتراف سب نے کیا ہے، اور اسی اعتراف کے نتیجہ میں حکومت ہند نے ۱۹۹۴ء میں آپ کو صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا، ۱۹۹۸ء میں شیخ محمد احمد پرتاب گڑھی ایوارڈ آپ کو ملا، اسی سال لکھنؤ کی اسلامی کونسل کی جانب سے آپ کو قومی ایوارڈ دیا گیا، ۲۰۰۱ء میں ممبئی کے اندر دینی خدمات کے اعتراف میں ہارون رشید علیگ کا یادگار ایوارڈ دیا گیا۔ مولانا کی زندگی ایک مخلص داعی کی زندگی ہے، جس

کی سب سے بڑی پہچان بے نفسی ہوتی ہے، مولانا میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے، مولانا نے اپنی تحریر وتقریر اور ایک ایک بول کو فکر اسلامی کی جڑوں کو استحکام بخشنے میں استعمال کیا، مولانا جہاں ایک مایۂ ناز انشاء پرداز، اردو اور عربی کے منفرد اسلوب کے مالک وادیب ہیں، وہیں آپ ایک شریف اور پاک طینت، دوسروں کے کام آنے والے، ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرنے والے انسان بھی ہیں۔ مبدأ فیاض نے آپ کو ہر طرح سے نوازا ہے۔

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے حضر میں

مولانا محمد احمد بیگ ندوی
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء

بیسویں صدی کے نصف آخر میں چمن زار ہند میں فکر اسلامی کی آبیاری اور اس کو فروغ دینے اور عربی زبان وادب خاص طور سے عربی صحافت کی گرانقدر خدمات کے حوالے سے جن ارباب فکر ونظر اور خامۂ جادو نگاراں کا حسین ودل آویز مرقع تیار کیا جائے گا، ان میں ایک نہایت ہی برگزیدہ، قدآور، دامن دل کو کھینچ لینے والا نام حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی حفظہ اللہ کا ہوگا۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

مولانا کا نام آتے ہی ذہن کے افق پر چاند کھیت کرتا ہے اور ٹھنڈی ودھیا چاندنی پھیلتی چلی جاتی ہے، آپ کے نام وکام کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہونے لگتا ہے آپ کی ہشت پہلو شخصیت اور گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ

زندگی کے خط وخال کو اجاگر کرنے کے لئے دفتر درکار ہے مصرع، سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے۔

میں اپنے درماندہ وتھکے ہوئے رہوار قلم کو موصوف کی عظمتوں وکمالات کے دربار جس کے در وبام پر وادی ایمن کا نور ہے کی دھلیز تک اس لئے لے جانے کی سعی ناتمام کر رہا ہوں کہ شاید اس دربار کی حسن زائیوں وجلوہ طرازیوں کے کچھ تابندہ نقوش ان لوگوں کے سامنے پیش کر رسکوں، جو حق وصداقت، بے باکی وجرأت، ایثار وتواضع، استقلال واستقامت، عقیدے کی پختگی وصلابت، دین کی حمیت اور اس کی ابدیت پر پختہ ایمان، خوئے دلبرانہ وادائے قاہرانہ، عزم وحوصلہ، مقصد کی لگن، فکر ونظر کی بلندی قوم وملت کی تعمیر وترقی کے لئے مثبت سوچ اور بادمخالف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مشن کی تکمیل کی جانب ہمت مردانہ کے ساتھ میں بڑھتے رہنے اور گردوپیش کی لایعنی چیخ وپکار، اعتراض وتنقید کے بگولوں کو اپنے فولادی عزم کے پیروں سے روندتے ہوئے منزل مقصود کے در وبام کو چھو لینے بلکہ تاروں کی جبین کو اپنے قدموں پر جھکا دینے کے ولولۂ تازہ کے سچے نمونوں کے متلاشی ہیں کیونکہ آئیڈیل ومثالی شخصیات ہی کسی قوم کی قوت وسربلندی کا سرچشمہ ہوتی ہیں اور ان کی پیشانی پر قوم کی ترقی وعروج افتخار وسرفرازی اور روشن مستقبل کے خطوط

ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو زمان ومکان کے حدود وقیود سے بالاتر ہوکر نسل انسانی کو مایوس کن حالات اور اداسیوں کے خوفناک منجدھار سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھاتی ہیں اور جن کے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز میں نسلوں کی تعمیر وتشکیل، عروج وارتقا کا سامان ہوتا ہے۔ ایشائی قومیں جہاں بہت سی انسانی وسماجی خصوصیات سے محروم ہوچکی ہیں وہیں ان کی اس حرماں نصیبی پر بھی خون کے آنسو رونے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اپنی ان محسن ہستیوں کو اپنے دلوں میں سجا کے نہیں رکھتیں جن کے فیضان نظر سے ان کی مردہ زندگی میں حیات تازہ کی روح انگڑائی لیتی ہے جب کہ یورپ کی فراخدلی وقدردانی دیکھئے کہ اپنی معمولی وبے حیثیت شخصیتوں کو بھی فنا نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ سرمۂ چشم بنا کر رکھتا ہے۔ اوران کی عظمتوں کی ایسی مورتیاں تراشتا ہے کہ جن کی دلآویزی اور دلفریبی سے یورپ کی رگوں میں نشاط وعمل کا خون بہاراں کی طرح رقص کرتا رہتا ہے، یورپ کی اسی قدردانی نے اس کے لئے دنیا پر اپنا تفوق وبرتری اور سکہ قائم کرنے کا راستہ ہموار کیا، یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ جو قومیں اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں اوران کے پیغام وہدایات کو سینے سے لگائے رکھتی ہیں، تو ترقی وسربلندی ان کو سرآنکھوں پر بٹھاتی ہے، مگر ہماری بے حسی تو دیکھئے کہ ہم اپنی ان نابغۂ روزگار ہستیوں کو اپنی غفلت مجرمانہ کے خنجر سے لہولہان کرتے رہتے ہیں جن کی

پیشانیوں کے اجالے میں ہمارا مستقبل جھلک رہا ہے اور جن کی حیثیت قوموں وملت کی رگوں میں خون کی ہے، بلکہ وہی دماغ ہیں جن کی بدولت قوم کا طائر تخیل سپہر کبود کی بلندیوں پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑتا ہے۔

اس ارض گیتی پر اربوں کھربوں سایے لرزتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر ان میں ایسے سایے کم ہی ہیں جو دوسروں پر اپنی عظمتوں کا پرتو ڈال کر ان کو عظیم بنا سکیں یا جن کی زندگی دوسروں کے لئے قابل تقلید اور حوصلہ بخش ہو، جن کی عزیمت کی کرنوں سے کہر زدہ فکر وخیال کو وسیع کائنات میں اپنی جولانی دکھانے کا موقع ملے، یا ان کے گفتار وکردار میں ایسے نورانی ہلکورے ہوں۔ جو فکر ونظر کے زنگ کو کھرچ کر پھینک دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں، مولانا محترم کی عظیم المرتبت وہمہ گیر شخصیت پر جب ہماری نظر پڑتی ہے تو زبان خاموش چپکے چپکے مگر وفور جذبات وشوق اور سرمستی کے عالم میں یہ زمزمہ گنگنانے لگتی ہے۔ کہ ''دامان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار'' نظر حیران، فکر پریشان، خیال جلووں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ دیکھ کر کہ جس کی کوکبی ومہتابی کو آسمان کی رفعتیں جھک کر سلام کرتی ہوں، اس کے جلوہ صدناز کی مرقع آرائی نوک قلم کے بس کی بات نہیں، مولانا تاریخ کی ایک انمول امانت ہیں، میں اپنی اس بکھری ہوئی تحریر کے ذریعے تاریخ کی اس عظیم امانت کو آنے والی نسلوں کے

حوالے کر دینا چاہتا ہوں تا کہ یہ نسلیں مولانا کے فکر ونظر اور علم وادب کے راستے کے غبار میں اپنی عظمتیں تلاش کر سکیں، اور اپنی کشت حیات کو مولانا کے جوئے نغمہ خواں سے سیراب کر سکیں۔

ڈاکٹر صاحب کو جس خانوادے کا چشم و چراغ ہونے کا شرف حاصل ہے وہ ارض طیبہ کا ایسا مقدس خاندان ہے جس کے اخلاص وایثار، تواضع وانکسار وسخاوت وسیر چشمی، جاں بازی وجاں سپاری کے تذکرے اس سرمدی کتاب کی زینت ہیں جو قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے آئی ہے، جس میں بار بار قبیلہ انصار کی بے لوث قربانیوں کو اجاگر کیا گیا ہے اسی قبیلے کے بارے میں قرآن کی یہ لازوال شہادت ہے ﴿والذین تبوؤا الدار والإیمان من قبلهم یحبون من هاجر إلیهم ولا یجدون فی صدورهم حاجة مما أوتوا ویؤثرون علی أنفسهم ولو كان بهم خصاصة ومن یوق شح نفسه فأولئک هم المفلحو﴾

ترجمہ:۔ جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرت میں مقیم تھے یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود

محتاج ہوں، حقیقت یہ ہے کہ جولوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالئے گے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

مولانا کا شجرۂ نسب میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا کے خاندان میں یہ شجرہ محفوظ ہے۔ مولانا کے اجداد ہندوستان کس صدی میں آئے اس کا تعین فی الحال میں نہیں کرسکا البتہ اتنی بات تو مسلم ہے کہ مولانا کا خاندان ہندوستان کے بتکدے میں صدائے توحید بلند کرنے کی غرض سے وارد ہوا۔ کیونکہ جب ہم ہندوستان میں اسلام کی آمد کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے کہ مختلف صدیوں میں عرب کے دعوتی قافلے ہندوستان کا رخ کرتے رہے اور یہاں اسلام کی نشر واشاعت اور اسلامی علوم وفنون کی ترقی اور فروغ میں حصہ لیتے رہے، مولانا کا خاندان مئو سے تقریباً ۸ کلومیٹر کی مسافت پر واقع گاؤں بختا ورگنج میں آباد ہوا، اور برسہا برس تک قرب وجوار میں دعوتی واصلاحی سرگرمیوں میں مشغول رہا، مولانا کے جدامجد مولانا شیخ محمد صابر بن شیخ محمد احمدؒ اپنے زمانے کے نامور علماء میں سے تھے اور بڑے علمی کمالات کے حامل تھے، آپ بختاورگنج سے ہجرت کرکے مئو چلے آئے، اور یہیں بودوباش اختیار کرلی، ایک عرصہ دراز تک آپ مئو ہی کے اندر اپنے علوم وفنون کا دریا بہاتے رہے پھر آپ نے

ریاست حیدرآباد کا رخ کیا اور وہاں نظام حیدرآباد کے بچوں کے اتالیق متعین ہوئے۔ ریاست حیدرآباد غیر منقسم ہندوستان کی وہ عظیم ریاست تھی جو انیسویں صدی کے اواخر سے ۱۹۴۷ء تک ایک ایسی طاقتور و با اثر ریاست تھی کہ جس کی علم نوازی و معارف پروری کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج رہا تھا اور جو ارباب کمال کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ رہی تھی یوپی، دہلی، اور بہار کے نامی گرامی علماء، شعراء و ادباء اس ریاست کے سایے میں اپنا جوہر کمال دکھا رہے تھے۔ داغ دہلوی متوفی ۱۹۰۵ء وقار الملک، محسن الملک، سر راس مسعود، مولانا عبدالباری ندوی علامہ سید سلیمان ندوی م ۱۹۵۳ء مولانا مناظر احسن گیلانی، لکھنؤ کے مشہور شاعر امیر مینائی متوفی ۱۹۰۰ء بابائے اردو مولوی عبدالحق، مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، جوش ملیح آبادی اور نہ جانے کتنے گنجہائے گرانمایہ اس دربار کی رونق و زینت تھے، اور ان کے دم سے علم و ادب کا بھرم قائم تھا مگر ان سب کے باوجود ان ارباب کمال کو ریاست کی گھٹی گھٹی اور تنگ فضا میں غیر ملکی ہی کہا جاتا تھا، آپ کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے جہاں اس طرح کے ارباب فن و کمال کا مجمع ہو وہاں اتالیقی کے لئے مولانا کے جد امجد شیخ محمد صابرؒ کے نام قرعہ نکلنا، مصرع قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند، ان کی عظیم المرتبت شخصیت اور علمی کمال کی آئینہ دار ہے سالہا سال تک آپ نظام حیدرآباد کے بچوں کی اتالیقی

کے منصب پر فائز رہے نظام آپ کے علمی کمالات، نسبی شرافت اور اخلاقی محاسن کا بڑا قائل ومداح تھا اور بے انتہا آپ کا ادب واحترام کرتا تھا، پڑھے لکھے لوگوں یا عوام کے دلوں میں اترنا بہت آسان ہے مگر کسی امیر کبیر کے دل میں عقیدت واحترام کا چراغ روشن کرنا انتہائی دشوار عمل ہے اس لئے امراء پر اقتدار ودولت کا ایسا زبردست خمار طاری ہوتا ہے جس کی بنا پر مشکل ہی سے کوئی ان کی آنکھوں میں کھب پاتا ہے اور اگر بالفرض یہ منزل مل بھی جائے تو کتنی جاں گسل وپیہ مار اور شمشیر کی دھار کی مانند خوفناک اور آگ کے مثل شعلہ زن ہوتی ہے کیونکہ ذرا سی چوک ہو جانے سے وہ آگ جس پر عقیدتوں کا گلاب چڑھایا جارہا تھا وہی آگ ڈسنے پر آمادہ ہوجاتی ہے یہی حال ہوتا ہے اہل اقتدار کا کہ ان کا قرب دودھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے، کسی وقت بھی قریب رہنے والا تلوار کی نوک کا شکار ہوسکتا ہے نظام حیدرآباد کے حالات ومزاج سے آگاہ لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ناک کا بال بننے والوں اور اس کے دل ودماغ پر چھانے والوں پر ایسا منحوس دور بھی آیا کہ کسی ادنی کوتاہی کی وجہ سے ان کی جان کے لالے پڑ گئے اور ان کو امان کی بھیک مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن مولانا شیخ محمد صابرؒ نے نظام حیدرآباد کے قرب میں جو زندگی گذاری وہ قابل رشک اور عزت واحترام کے پھولوں سے مہکتی ہوئی زندگی ہے، آپ کے قیام حیدرآباد

میں کوئی ایسا ناخوشگوار و تلخ واقعہ نہیں ملتا کہ آپ نظام کے غیظ و غضب اور عتاب کا شکار ہوئے ہوں، ورنہ وہاں قیام کرنے والے اکثر ارباب فن کی زندگی میں نظام کے عتاب کے خوفناک شعلوں کی لپک دکھائی دیتی ہے۔

شیخ صابرؒ صرف صاحب علم ہی نہیں تھے بلکہ صاحب دل اور بادۂ معرفت سے سرشار بھی تھے اللہ نے آپ کی عمر میں بڑی برکت عطا فرمائی اور پوری عمر علم کی خدمت میں گذاری۔ ۱۹۵۵ء میں قید حیات سے آزاد ہوئے اور جان جانِ آفریں کے حوالے کردی۔ دنیا سے کوچ کے وقت آپ کی عمر ایک سو دو سال تھی گویا آپ کی ولادت ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے چار سال قبل ہوئی ہندوستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے ۱۹۵۵ء تک طویل عہد ہندوستان کی تاریخ کا نہایت ہی انقلاب خیز دور ہے۔ اسی دور میں مختلف مسلم تحریکیں برپا ہوئیں۔ ادارے قائم ہوئے، علی گڑھ تحریک پروان چڑھی اور مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی، برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے باشندگان وطن کی جدوجہد کی حسین داستانیں بھی مرتب ہوئیں، انہوں نے جہاں انگریزوں کی عیاری و شاطری اور لڑاؤ اور حکومت کرو کے تماشے دیکھے وہیں آزاد ہندوستان کو تعصب و نفرت کی آگ میں جھلستے ہوئے بھی دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ الحدیث مولانا شیخ محمد ایوب صاحبؒ متوفی

۱۹۸۴ء اپنے وقت کے نامور علماء میں سے تھے، فن حدیث کے افق پر آپ ایک روشن ستارے کی حیثیت سے پوری زندگی چمکتے رہے، ہندوستان کے متعدد شہرت یافتہ اداروں میں آپ کی مسند حدیث سجی رہی، اور آپ اس کی زینت بنے رہے، فن حدیث کے علاوہ دیگر علوم میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا، مگر سرمایہء کمال حدیث ہی رہا، اور کیوں نہ ہو جن اساتذۂ حدیث کے چشمۂ صافی سے آپ نے استفادہ کیا تھا ان میں ایک نہایت ہی تابندہ وروشن نام فخر ہندوستان علامہ انور شاہ کشمیری کا ہے، آپ علامہ موصوف کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، باکمال استاد کی نظر عنایت وتوجہ خاص نے آپ کی رگ رگ میں حدیث کا ایسا ذوق سمویا کہ یہ فن ان کی پہنچان بن گیا، اور اسی فن کے ہو کے رہ گئے۔ فراغت کے بعد برسوں مفتاح العلوم مئو میں حدیث کی اہم کتابیں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بحیثیت شیخ الحدیث آنے کی دعوت دی گئی، آپ اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے تشریف لائے مگر یہ سلسلہ ڈیڑھ سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکا، یہاں قیام کے دوران بخاری ومسلم کے خزانوں کو طلبا کے درمیان لٹاتے رہے، اور اپنے دلنواز والہیلے انداز تدریس کی بدولت شہرت کے بال وپر لگا کر اڑنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں گجرات کی سرزمین آپ کے لئے بے قرار ہوا ٹھی اور محدثین وتابعین کی روحوں

نے لبک لبک کر آپ کو پکارا چنانچہ آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ گجرات کا رخ کریں کیونکہ گجرات کی مٹی میں محدثین وتابعین کا لہو کچھ ایسا شامل ہے کہ اس کی مہک آج تک باقی ہے۔ کشش کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے آپ کے اجداد کرام اس قافلے میں شامل رہے ہوں جو اوائل اسلام میں سرزمین گجرات سے ہم آغوش ہوا تھا اور اس کی نگوں تقدیر کو اسلام کی سرفرازیوں سے بیدار کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے کہ صحابہ وتابعین کے وفود میں مدینے کے بعض حضرات انصارؓ بھی ہیں جیسا کہ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب "العقد الثمین فیمن ورد من الصحابة والتابعین" میں ذکر کیا ہے، بہرکیف ۱۹۶۲ء میں ڈابھیل کے دارالعلوم میں بحیثیت شیخ الحدیث تشریف لے گئے اور تادم واپسیں وہیں حدیث شریف کی تدریس میں ہمہ تن مصروف رہے۔

آپ کو تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا، وقتاً فوقتاً مضامین سپرد قرطاس کرتے رہتے تھے، زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری المتوفی ۶۵۶ھ کی مشہور زمانہ کتاب الترغیب والترہیب جو چار جلدوں میں تقریباً گیارہ سو ۱۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس کا اردو میں ترجمہ وتشریح مکمل کرلی تھی۔ ڈابھیل کے ایک سفر میں طباعت کے لئے وہ مسودہ ساتھ تھا مگر افسوس کہ جس صندوق

میں وہ رکھا ہوا تھا وہ کہیں چھوٹ گیا، اس مسودے کے ضائع ہوجانے کا آپ کو زندگی بھر صدمہ رہا کیوں کہ یہ آپ کی بڑی قیمتی کمائی تھی اور بڑی محنت سے اس کام کو مکمل کیا تھا۔

آپ علم وآگہی، زہد وتقوی، معرفت وللّٰہیت، ایثار وتواضع کا پیکر تھے، حدیث شریف سے اشتغال کے اثرات آپ کی پوری کتاب زندگی میں دیکھے جاسکتے ہیں، آپ کی بے ریا زندگی، صلح پسندی، تقوی وطہارت کو دیکھ کر بلا شبہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی زندگی حدیث شریف کی برکتوں کی خوشبو سے مشکبار تھی۔

مولانائے محترم کی والدہ ایک ایسے علمی ودینی گھرانے کی چشم وچراغ تھیں کہ جہاں ''ایں خانہ ہم آفتاب است'' کی جلوہ گری تھی میری مراد استاذ الاساتذہ حافظ عبداللہ مئوی ثم غازیپوری متوفی ۲۶ رنومبر ۱۹۱۸ء ہے، علامہ موصوف مولانا کی والدہ کے پرنانا تھے، عامل بالحدیث تھے ان کی ذات پر علم کو فخر اور عمل کو ناز تھا ان کے عہد میں حدیث کی تدریس ان کے دم سے زندہ تھی، بے شمار علوم میں کامل دست گاہ رکھتے تھے، علم حدیث میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی ان کے استاد تھے موصوف کی ولادت مئو میں ہوئی، مگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں کو متاثر کیا، مئو بھی اس کی زد سے

بچ نہ سکا چنانچہ علامہ کے والدین ہجرت کر کے غازیپور چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے، علامہ تبحر کے ساتھ زہد وتقوی کی صفت سے بھی متصف تھے بلا کے ذہین تھے، علامہ شمس الحق صاحب عون المعبود نے ان کی ذہانت کا ایک واقعہ چند علما کے مجمع میں یوں بیان فرمایا کہ میرے کتب خانہ میں ایک بہت پرانی کتاب منطق کی تھی عبارت کی پیچیدگی کے ساتھ مسائل منطقیہ کا بیان کچھ اس طرز سے تھا کہ بظاہر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا جناب حافظ صاحب اتفاق سے دیا نواں تشریف لائے میں نے وہ کتاب دکھا کر کہا کہ یہ تو چیستاں معلوم ہوتی ہے۔ حافظ صاحب نے کتاب کے چند ورق الٹنے کے بعد فرمایا: کچھ نہیں مسائل وہی ہیں عبارت ذرا پیچیدہ ہے اس کے ساتھ ہی آپ نے بعض مضامین کا مطلب عام فہم انداز میں بیان فرمادیا، مولانا کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تھی بعض تلامذہ بڑے باکمال ہوئے، آپ نے زندگی بھر درس وتدریس کی مسند کو اپنے علمی کمالات سے آراستہ رکھا۔ لکھنؤ کو بھی اپنے فیضان سے محروم نہ رکھا۔ ندوۃ العلماء کے چیدہ طلبا نے بھی آپ سے علمی استفادہ کیا مگر لکھنؤ کا یہ سفر آپ نے اسوقت کیا جب زندگی کا آفتاب لب بام آچکا تھا چنانچہ کچھ ہی مہینے یہاں قیام کر سکے بالآخر زندگی کی شام ہوگی اور مدتوں علم وعرفان زہد وتقوی کی کرنیں لکھ نے والا آفتاب ہمیشہ ہمیش کے لئے غروب ہو گیا، نماز جنازہ شیخ محمد خلف شیخ

حسین نے پڑھائی۔ ان کے انتقال پر مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اس طرح اپنے دکھ وغم کا اظہار کیا، آہ عبداللہ! میری آنکھوں نے تیرے جیسا کامل عالم نہیں دیکھا، سننے میں تو بہت آئے مگر تو چیزے دیگر است، علامہ موصوف کے خاندان میں علم کی فرمانروائی کی داستان کافی قدیم ہے، بڑے بڑے علماوارباب کمال اس خاندان میں پیدا ہوئے اور دوام کے دربار میں جگہ پائی، غازی پور، مئو، اعظم گڑھ کے علماء کے تذکروں میں ان کے علمی کمالات کی تفصیلات دیکھ کر بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس خاندان کے علما وفضلاء ہندوستان کی اسلامی، علمی، تہذیبی، ثقافتی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں، ایسے مقدس ودلآویز علمی خاندان کی روح پرور فضاؤں میں استاد محترم کی والدہ نے آنکھیں کھولیں، اور اپنے سامنے علم کی بادنسیم کو ہولے ہولے سے مچلتے ہوئے دیکھا، اور علم وعمل کی جامعیت کا دل کش منظر کا مشاہدہ کیا، استاد محترم کی والدہ علامہ موصوف کی پرنواسی تھیں، اور مشرقی روایات کے مطابق اگلے وقتوں میں خواتین کی تعلیم وتربیت کا جو نظم تھا اس کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت ہوئی چونکہ نانہال علم کے نغموں سے گونج رہا تھا، اس کا طبعی اثر آپ پر پڑا اور علم وعمل دونوں کا شوق رگ وریشے میں سرایت کر گیا، اور زندگی بھر علم وعمل کی کرنیں لمعہ افگنی کرتی رہیں، آپ بڑی نیک اور خدا رسیدہ بندی تھیں، بڑی لمبی عمر پائی،

۲۰۰۰ء میں اللہ کو پیاری ہوئیں، ، مولانا کی دینی واسلامی ذہن کی تشکیل میں آپ کی والدہ کا بڑا کردار ہے، خدا غریق رحمت کرے، بال بال مغرفت فرمائے اور فردوس کے بالاخانوں میں جگہ عطا فرمائے۔

یہ ایک ہلکی سی جھلک اور مختصر سا خاندانی پس منظر، نگاہوں کو خیرہ کردینے والا عظیم الشان ماضی ہے اس عزیمت کے پہاڑ، ذروں سے ستاروں تک سفر کرنے، تاریخ کی پیشانی پر اپنی عظمتوں کے نقوش ثبت کردینے والے مہر ووفا کے پیکر کا جس کی زندگی کے اوراق پر خلوص، ایثار جہد مسلسل، محنت پیہم اور فرض شناسی کی خوبصورت تحریر لکھی ہوئی، اور جو نصف صدی سے اپنے سحر طراز قلم سے فکر اسلامی اور ادب اسلامی کا آب حیات ٹپکا رہا ہے، اور پوری تن دہی کے ساتھ اپنے فردوس کی تعمیر میں اس طرح مصروف ہے گویا اس کی حیات مستعار کی اصلی پونجی یہی ہے اور سچی بات ہے بھی یہی اسی کو کہتے ہیں انجام پر نظر اور انجام کی فکر، مشین کی طرح کام کرنے والے تو ہزاروں ملیں گے مگر کیا ان کو اپنے حسن انجام کی بھی فکر ہے؟ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ایک مومن صادق اور دنیا پرست کے مابین فرق نمایاں ہوتا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ ''پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھے جاتے ہیں'' مولانا نے ۱۴ر مئی ۱۹۳۶ء میں جب اس خاکدان میں آنکھیں کھولیں اور

نظریں اٹھا کر گھر کے ماحول کو دیکھا تو گرد و پیش کی فضا کو علم کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی کرتے پایا، پورا ماحول علم کے کوثر و تسنیم میں ڈوبا ہوا تھا والدین تو علم و عمل میں اپنی مثال آپ تھے ہی، بہت سے افراد خاندان بھی زلف علم کے اسیر تھے، مولانا کہاں کسی سے پیچھے رہنے والے تھے، پھر قدرت نے جس کو بڑے بڑے کاموں کے لئے پیدا کیا ہو وہ پیچھے رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ''ہرے ہرے بروا کے چکنے چکنے پات'' نخل علم وادب کی خوشہ چینی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیلائے مقصود سے ہم آغوش ہونے کے لئے رات دن ایک کر دیا، اور یہی لیلائے مقصود ہی تو تھی جو ۱۹۵۲ء میں ندوۃ العلماء کھینچ کر لائی، اور یہی وہ تڑپ تھی جو آپ کو ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کی خدمت میں ایک طالب علم وادب کی حیثیت سے بغداد لے کر گئی، وطن سے یہ دوری و مہجوری کوئی بے سبب نہ تھی، اس کے پیچھے علم وادب کے موتی سے دامن بھر لینے کا وہ اتھاہ جذبہ کا رفرما تھا جس نے آپ کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت جاگزیں کر دی تھی کہ ''کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی'' بس اسی کمال کی دھن تھی جس کے سبب دن و رات ایک کر دیا، پھر زمانے نے دیکھ لیا کہ محنت پیہم کے نتیجے میں کس طرح جوہر نکھر گیا، اور شہرت و مقبولیت نے بلائیں لیں، سستی اور جھاگ کی طرح حقیر شہرت نہیں بلکہ کوہ ہمالہ سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم اور توانا شہرت جس کی بنیاد علم

وعمل پر قائم ہے، یہ سچی شہرت انہیں یوں ہی کسی نے ہاتھ اٹھا کر نہیں دے دی۔ بلکہ یہ دماغ کا ست اور آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ ''دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک''۔

مولانا کی بوقلموں شخصیت ایک ایسا حسین نگار خانہ ہے جس میں محاسن وکمالات کی سیکڑوں جاندار تصویریں چلتی پھرتی اور نگاہوں کو جمال وجلال سے آسودہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مولانا نے ندوۃ العلماء میں اپنے ذوق وظرف کے مطابق عربی زبان وادب کے ساغر لنڈھائے اور خوبیٔ قسمت کہ ساقی بھی خوب ملا ایسا کہ جس میں عرب کا سوز دروں اور عجم کا حسن طبیعت دونوں کی نمود تھی اور وہ تھے مجدد عصر ،مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ متوفی ۱۹۹۹ء۔ ہر چیز میں منفرد تقریر میں تحریر میں، فکر ونظر میں، گفتار وکردار میں اپنی مثال آپ معاصرین میں کس کا جگر تھا جو ان کی ہمسری کرتا پھر بھی تواضع وانکسار کا پتلا تھے، پاک دل وپاکباز، وہ ایک ہی فن کے شہسوار وامام نہیں تھے خدا معلوم علوم وفنون کے کتنے خزانے ان کے سینے میں محفوظ کر دیئے گئے تھے، ایسی عبقری ہستی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کی سعادت پر آفریں صد آفریں، کامل استاد نے تراش کر کوہ نور ہیرے سے کڑوں اربوں کھربوں گنا قیمتی بنا دیا، پھر پتھر چاہے جتنا قیمتی

ہوجائے اسے انسان سے کیا نسبت پھر ایسا انسان جو آج ہماری قومی وملی زندگی میں آبرو کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دم قدم سے سیکڑوں علم کی سبیلیں لگی ہوئی ہیں، اور اس کے آب حیات سے سوکھے درختوں کو ہریالی نصیب ہورہی ہے ،وہ قوم کا سچا خادم ہے اور موجودہ ہندوستانی علما کی صف میں وہ اپنی بعض ملی خدمات کی بنا پر اس مقام پر فائز ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا کا مادر علمی تو ہے ہی اس سے بڑھ کر خدا معلوم کیا کیا کچھ ہے، ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی اور اس کے افکار ونظریات کی ترویج واشاعت میں جہاں ان کے پیش روؤں کا خون جگر شامل ہے، ڈاکٹر صاحب کی بھی قربانیاں قابل قدر ولائق صد تحسین ہیں، اس ادارے کے تئیں آپ کے دل میں خلوص کا جو دریا موجزن ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جس کو تھوڑی دیر بھی آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، کس دردمندی کے ساتھ وہ اس عالمگیر اسلامی قلعے کی حفاظت اور اس کی ترقی کے لئے بے کل وفکر مند رہتے ہیں، بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ موصوف اپنی ذات پر آنے والی آنچ کو تو برداشت کر گئے مگر اپنے اس ادارے کی پیشانی پر معمولی غبار دیکھ کر تڑپ اٹھے، ایہ صدق وخلوص کی سچی نشانی نہیں تو اور کیا ہے ورنہ جن کا خلوص محض نمائشی اور دکھاوے کے لئے ہوتا ہے، بہت جلد وہ بے نقاب ہوجاتے ہیں، مگر ان کا چولا

اتنا دل کش ونظر فریب ہوتا ہے کہ دھوکہ کھانے میں دیر نہیں لگتی، لیکن قربان جایئے، مولانا کا ایثار وخلوص اتنا مقدس، اتنا پاکیزہ ہے کہ آپ سے اختلاف رکھنے والا بھی آپ کی اس خوبی کا قائل ومداح ہے، ندوۃ العلماء سے آپ کا تعلق فدائیت کے درجہ تک پہونچا ہوا ہے، اور یہ ندوے کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کو ہر دور میں اپنے پر جان چھڑکنے والے نصیب ہوتے رہے، ندوۃ العلماء سے مولانا کے تعلق کی کئی جہتیں ہیں، اور سب کی پیشانی روشن ودرخشاں، کامیاب بامراد، قابل فخر وناز، لائق رشک وتقلید، طالب علمی کا زمانہ ہو یا مدرسی کا، کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے عمید کا عہدہ ہو یا منصب اہتمام، کوئی بتائے کہ کہاں کامیابی نے قدم نہیں چوما، اور سرفرازی نے جھک کر آستاں بوسی نہیں کی، آپ کے منہ میں زبان ہے جو چاہیں کہیں مگر ذرا انصاف کیجئے کہ مولانا جن گوناں گوں ذمے داریوں میں گھرے ہوئے ہیں ان کو نبھانا کوئی بازیچہء اطفال نہیں ہے، اس کے باوجود مولانا کے تمام کاموں میں سلیقہ وقرینہ کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی کام کیا مجال مؤخر ہوجائے، اہتمام کا کانٹوں بھرا تاج ہی لہولہان اور حوصلے کو زہر آب کرنے کے لئے کافی تھا مگر یہ نہ بھولئے کہ ''البعث الاسلامی'' کی ادارت کا بار بھی آج سے نہیں کل سے نہیں تقریباً ۳۰ رسال سے آپ کے دوش پر ہے، مضمون نگاری کی عمر تو ۵۳ رسال ہونے کو آئی صرف ایڈیٹوریل لکھ

دینے کی بات ہوتی تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں، حالانکہ یہ بھی انتہائی پتا مار کام ہے، یہاں تو نوعیت ہی الگ ہے پورے پرچے کے ایک ایک مضمون کی نوک پلک درست کرنا، پھر تمام مضامین کے پروف کی درستگی واصلاح ،کیا کوئی لڑکوں کا کھیل ہے، اس کے علاوہ البعث میں مرحومین پر اشک حسرت وغم مولانا ہی کا قلم برساتا ہے، کتابوں پر تبصرے آپ ہی کے خامۂ جادونگار سے کتابوں کی تعیین قدر کرتے ہیں پھر الرائد کے لئے ہر پندرہ روز پر ''کلمة الرائد'' لکھنا اور وہ بھی کرنٹ موضوعات پر، عربی اردو میں سیکڑوں کتابوں پر وقیع وجاندار مقدمے اور ہندوستان کے سیکڑوں مدرسوں، تنظیموں کے لئے توصیات تحریر کرنا، آئے دن اندرون وبیرن ملک علمی، دعوتی، ودینی اسفار، ندوۃ العلماء میں اہتمام کی نازک ذمہ داریوں کے علاوہ روزانہ مسلسل کئی کئی گھنٹے پڑھانا، مختلف عصری دانش گاہوں میں لکچرس، اور تعلیمی مشورے، ندوے کی مسجد کی امامت وخطابت، اور خطابت بھی ایسی کہ جیسے بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں یہ سارے کام باقاعدگی وانضباط کے ساتھ انجام دینا، اسی شخص کے بس کی بات ہے جو توفیق ایزدی کی دولت سے مالا مال ہو۔ جرمنی کے مشہور فلسفی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پرست اس کی پابندئ اوقات کو

یورپ والوں کا حصہ خیال کریں تو کرتے رہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ہمارے حلقہ علما میں پابندی اوقات میں مولانا کا کوئی جواب نہیں ۔ آندھی آئے، طوفان آئے، آسمان شعلے اگلے، ہوائیں برف کی چادر پھیلائے ڈسنے کو تیار، مگر کیا مجال کہ مولانا کے معمولات کی پاکیزہ رفتار میں ایک منٹ ادھر ادھر کا فرق آجائے، مولانا بچپن ہی سے شب بیداری وسحر خیزی کے آداب سے واقف ہیں، حضر میں تو اس کا اہتمام کسی قدر آسان ہے تاہم سفر میں اس کا اہتمام جان جوکھم میں ڈال کر ہی کوئی کرسکتا ہے۔ مگر مولانا ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کے لئے سفر وحضر سب یکساں ہے، کوئی بھی موسم ہو مولانا کی تہجد کی نماز کبھی نہیں چھوٹی حتی کہ سخت علالت کے ایام میں بھی معمولات بدستور جاری رہتے ہیں جو دیدۂ بینا رکھتے ہیں وہ مولانا کے دمکتے ہوئے چہرے سے شب بیداری کے نور کو ابلتا ہوا دیکھ سکتے ہیں، ہم میں سے کتنوں کو یہ دولت نصیب ہے؟ مولانا کی برکتوں سے معمور زندگی کے سرچشموں کا اگر سراغ لگایا جائے تو بآسانی ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ کتاب وسنت کی پیروی ہی آپ کی قوتوں کا سب سے بڑا راز ہے، قرآن کی تلاوت ہر مسلمان کرتا ہے، مگر مولانا جس التزام کے ساتھ خدا کی کتاب کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے موتیوں کو چننے کی کوشش کرتے ہیں انہیں کا حصہ ہے، علم وادب کی جانب اعتنا کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس کی فکر مولانا کے

قلب سلیم کی واضح دلیل ہے۔ چنانچہ روحانی بالیدگی کی تلاش نے آپ کو شیخ الحدیث مولانا زکریا سہارنپوریؒ تک پہونچایا اور ان سے شرف بیعت حاصل کیا۔

اب آیئے ہم آپ کو ندوۃ العلماء سے دور مولانا کی عظمتوں کے ایک ایسے نرالے دربار میں لے چلتے ہیں جہاں کی دنیا اس سے مختلف جہاں کے چہرے آپ کو کچھ اجنبی اجنبی سے دکھائی دیں گے مگر ان کی پیشانی پر ابھری ہوئی تحریروں کو ذرا دیکھئے لکھا ہوا ہے ''ملت کی نیا کے کھیون ہار''۔ ۱۸۵۷ء کے خونچکاں رستا خیز کے بعد اسلامیان ہند کے دلوں پر شکست اور مایوسی کے جو گہرے زخم تھے اس پر مرہم رکھنے اور مایوسی کے سیاہ بادلوں کا سینہ چاک کرنے کے لئے جہاں ایک طرف علمائے امت نے عملی اقدام کیا، اور سرمایہ ملت کی نگہبانی کے لئے سرگرم عمل ہوگئے تو دوسری جانب سرسید احمد خان ۱۸۱۷-۱۸۹۸م جیسے لوگوں نے بھی خون دل وجگر کی پونجی لے کر مسلم قوم کی آبرو رکھنے کے لئے جدید تعلیم کا ڈول ڈالا، اسلامیان ہند کو دونوں نوعیتوں کی تعلیم کی سخت ضرورت کل ماضی میں بھی تھی اور آج بھی ہے بلکہ آج اس کی ضرورت دوچند ہوگئی ہے، صرف ایک ہی تعلیم کے بل بوتے پر ہم چاہیں کہ ہمارا کاروانِ ترقی آگے بڑھتا جائے تو میری ناقص رائے میں یہ ایک غیر متوازن

وخطرناک سوچ ہے جس سے ہمارا ملی جسم توانا وتر وتازہ رہنے کے بجائے سوکھ کر ٹھوٹھ ہوجائے گا، اس لئے ہم کو زمانے کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ قوم مسلم کی کس دور میں کس چیز کی زیادہ ضرورت ہے پھر اس کے مطابق اٹھنے والا قدم ملت کو جہانِ تازہ اور نئی قوتوں کے سرچشمے فراہم کرے گا۔

سرسید مرحوم نے قوم کی زبوں حالی کو پیش نظر رکھ کر اپنے بے پایاں خلوص وصدق نیتی سے یہ ثابت کردیا کہ مرحوم کا وہ قدم نہایت مبنی بر دور اندیشی، اور قوم کی سوکھی کھیتی کو پانی دینے کا بروقت انتظام تھا۔

آمدم برسر مطلب

انٹگرل یونیورسٹی کے حوالے سے جب ہم حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی حفظہ اللہ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ ہم کو سرسید مرحوم کی صف میں شانہ بشانہ نظر آتے ہیں کیونکہ آپ نے ندوۃ العلماء سے پوری وفاداری، وجاں نثاری کے ساتھ قوم کی عصری ضرورت کی بنا پر جو خاموش مگر جرأت مندانہ قدم اٹھایا وہ یقینا آپ کا ایسا زبردست اور ملت کے تن مردہ میں روح پھونکنے والا کارنامہ ہے جس میں اس دور کے صف علما میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں، بے شک اس اقلیتی یونیورسٹی کے قیام وترقی میں آپ کے رفقاء بالخصوص سید وسیم احمد صاحب کی شب وروز کی جان توڑ محنت وقربانی لائق صد

تحسین۔مگر اس عروس لالہ کی حنابندی مولانائے محترم کے خون جگر سے ہوئی اور اس کے ماتھے پر افشاں آپ ہی کے دست کرم نے چنی۔

خون دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات　　فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

انٹگرل یونیورسٹی کو قائم ہوئے ابھی سال ہی کتنے ہوئے، صرف پندرہ برس ۱۹۹۲ء میں اس کی پہلی اینٹ رکھی گئی مگر کچھ اس خلوص و سچے جذبے سے کہ دن دونی رات چوگنی یہ ترقی کرتی چلی گئی اور ایک سال ہوئے گورنمنٹ نے اس کو اقلیتی ادارے کا درجہ دے کر اپنی فراخدلی اور وسیع النظر کا بین ثبوت دیا، مسلمانوں کی یہ واحد یونیورسٹی ہے جس کو اتنی قلیل ومختصر مدت میں یہ درجہ حاصل ہوگیا، ورنہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو دور خاپن اختیار کیا جارہا ہے اس کی بنیاد پر حکومتوں سے کوئی ایسی توقع نہیں کی جاسکتی جس کا تعلق مسلمانوں کے روشن مستقبل سے ہوتا، ہم اس یونیورسٹی کے بانیوں اور کرتا دھرتا لوگوں کی نیک نیتی ہی کا ثمرہ ہے کہ اس نے چند سالوں میں اپنی جڑیں مضبوط کرلیں اور قوم کے سامنے اپنی افادیت اور ضرورت کو اجاگر بھی کردیا۔ یہ یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے لئے ایک بیش بہا اور لازوال تحفہ ہے جس سے مسلم قوم کے لئے اپنی دنیوی ترقی کے راستے ہموار ہوں گے، مولانائے محترم اس کے چانسلر ہیں اور آپ کی قیادت وسرپرستی میں یہ یونیورسٹی اپنا

علمی وترقیاتی سفر طے کررہی ہے خدا اس کے اقلیتی کردار کو زمانے کی نظر سے محفوظ رکھے، اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے میدان میں سرگرم رکھے، وسائل تو بہت سوں کے پاس ہوتے ہیں۔لیکن ان وسائل کا صحیح استعمال سخت امتحان کا کام ہے جن کے سینوں میں قوم وملت کا سچا درد، اوراس کی ترقی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے، وہی وسائل کا صحیح استعمال کرکے قوم کو فائدہ پہونچاتے ہیں ورنہ یہ بھی مشاہدے میں آتا ہے کہ لوگ اپنے اثر ورسوخ اور تعلقات سے اپنی ذات کے سوا کسی اور کو نفع پہونچانا نہیں جانتے۔بس وہ اپنی محدود ذات کے گنبد میں محصور ہوکر رہ جاتے ہیں اس پہلو سے مولانا کی زندگی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو آپ کے خلوص اور بے لوث خدمت کے اجالے لامحدود وسعتوں کو اپنی بے کرانی سے منور کرتے دکھائی دیتے ہیں، خدانے عربوں کی نگاہ میں آپ کی قدر ومنزلت، عظمت واحترام، اثر ورسوخ کا جو تاج محل تعمیر کردیا ہے آپ اگر کوئی دنیا پرست ہوتے تو اس کا سہارا لے کر دولت کے خزانے سمیٹ لیتے مگر کون نہیں جانتا کہ سادگی آپ کی زندگی کا وہ امتیازی نشان ہے کہ جس کی جھلک ہر چیز میں دکھائی دیتی ہے۔لباس میں، کھانے میں، مکان میں، ہر جگہ سادگی کا سایہ، مولانا کے گھر جن لوگوں کو جانے اور وہاں کی سادگی کا مشاہدہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ میری بات کی ضرور تصدیق کریں گے۔معمولی معمولی لوگوں

کے گھروں کی آرائش دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مگر مولانا بے پناہ عظمتوں کے باوجود سادگی کا مجسم پیکر ہیں۔

مولانا ایک ماہر صحافی صاحب طرز ادیب وانشا پرداز، کامیاب وبلند پایہ مصنف، منفرد و بے مثال خطیب ہیں۔ ہندوستان میں عربی صحافت کو جن چند لوگوں سے عزت ووقار حاصل ہوا ان میں ایک باوقار نام مولانا کا بھی ہے، تقریبا پچاس سال سے آپ کا قلم گہربار بے تکان اسلامی فکر کی آبیاری اور اسلام مخالف نظریات وافکار کی بیخ کنی میں پوری توانائی کے ساتھ مصروف ہے، آپ کا طرز نگارش بالکل منفرد اور اچھوتا ہے اور یہ خوبی کسی بھی صاحب قلم کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب فکر وبیان کی انفرادیت تحریر کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیتی ہے، اسلوب سے مصنف کی شخصیت جھلکتی ہے، اسلوب محض موضوع کی زیبائش اور آرائش نہیں بلکہ اسلوب وسیلہ ہے جو موضوع یا مضمون کو فن میں تبدیل کر دیتا ہے، کارلائل نے لکھا ہے کہ اسلوب کسی ادیب کا کوٹ نہیں ہے کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا، یہ انسان کی جلد سے مشابہ ہے، اسلوب طرز فکر اور پیرایۂ بیان کے امتزاج کا نام ہے، فکر کے بغیر کوئی اسلوب ممکن نہیں، اسلوب کے لئے فکر کی انفرادیت بنیادی چیز ہے۔

مولانا کے قلم میں عظمت وبلندی، سلاست اور دل نشینی، درد وگداز،

ترنم وشیرنی، تاثیر وکشش کی وہ رنگارنگی ہے جو قاری کو ذہنی اور جذباتی طور پر کسی نہ کسی حد تک مولانا کے فکر وخیال کا ہم نوا ہوجانے پر مجبور کردیتی ہے یہی اعلیٰ ادب پارے کا تقاضا ہے اور یہ تقاضا ان کی تحریروں میں شدت سے موجود ہے، عام طور سے صحافیوں کا اسلوب وقتی رفتار کے ساتھ چلتا ہے، اور پھر وہ زندہ نہیں رہتا، ماضی میں سیکڑوں اردو صحافیوں میں صرف مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ شرف حاصل ہوا کہ کوچۂ صحافت میں صحرانوردی وآبلہ پائی کے باجود انہوں نے ایک ایسا اسلوب چھوڑا، صحافت کا غبار جس کی تازگی وتب وتاب کو چھپا نہیں سکا، اور ان کے سحر آفریں قلم نے ''الہلال'' کے صفحات پر جو نقش ونگار سجائے تھے آج بھی وہ ادب عالیہ کا درجہ رکھتے ہیں اور اردو زبان وادب کا شاہ کار ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی عربی تحریروں میں بلا کی قوت وادبیت، غضب کی کشش وتاثیر پائی جاتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی آپ کی تحریریں پڑھے اور وہ آپ کا گرویدہ واسیر نہ ہوجائے اسی کو کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے مجھے یقین ہے کہ زمانے کی دھوپ چھاؤں سے آپ کا اسلوب محفوظ رہے گا، کیونکہ رعنائی بیان کے سینے میں فکر کی وہ ابدی قوت مچل رہی ہے جس کا سوتا کبھی خشک نہیں ہوتا۔

مولانا کی علمی وادبی فتوحات کا دائرہ کافی وسیع ہے جہاں آپ نے

ہندوستان کی عربی صحافت کے نقشے پر نئی لکیریں کھینچی ہیں، وہیں عربی میں مستقل تصانیف سے عربی زبان وادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے، آپ کی مایہ ناز کتاب شعراء الرسول فی ضوء الواقع والتقریض اپنے موضوع پر منفرد اور انتہائی وقیع کتاب ہے، یہ دراصل آپ کے دکتوراہ کا مقالہ ہے جس پر آپ کو ۱۹۹۲ء میں ندوۃ العلماء اور اس کے ساتھ کئی موقر یونیورسٹیوں نے ڈاکٹر کی ڈگری عطا کی مولانا پہلے شخص ہیں جن کو ندوۃ العلماء نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے کر اپنی عزت میں اضافہ کیا کیونکہ مولانا اپنے علم وروشن کارناموں کی بنا پر کاغذی ڈگریوں وسندات سے بلند تر ہیں، اس کتاب میں مولانا کے جادونگار قلم نے اقلیم سخن کے ان تاجداروں کو موضوع گفتگو بنایا ہے جن کے سروں پر سرور کونین محمد عربی ﷺ کی تائید وتحسین کا نورانی تاج رکھا ہوا ہے، اور جن کو دربار رسالت کا شاعر ہونے کا ایسا لازال شرف حاصل ہے کہ جس شرف کے بعد دنیا کی تمام عظمتیں ہیچ، یہ کتاب ایک ادبی شاہ کار اور ادب کے متلاشیوں کے لئے ایک گنجینۂ بے بدل ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب ''ساعۃ مع العارفین'' ان صدق وصفا کے پیکروں کے تذکرے پر مشتمل ہے جن کی پیشانی کے نور سے ظلمت زدہ زندگی میں ایمان وعمل کی برقی لہریں اٹھنے لگتی ہیں: آپ کی دیگر کتابیں کچھ اس طرح

ہیں، محدث الهند الكبير حبيب الرحمن الاعظمی علیہ الرحمۃ، الأدب والإسلام، ندوة العلماء تواجه التحدی الكبير، احمد بن عرفان الشهيد، اس کے علاوہ آپ نے مختلف مصنفین کی اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کیا، جیسے مفکر اسلام، آپ حضرت مولانا علی میاںؒ کی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم کا ترجمہ جو علامہ ابن تیمیہ اور ان کے اہم وممتاز شاگردوں کے متعلق ہے، دوسری کتاب صورتان متضادتان ہے، جو حضرت مولانا کی کتاب دو متضاد تصویروں کا ترجمہ ہے، حضرت مولانا کی تیسری کتاب پندرہویں صدی ہجری کا ترجمہ القرن الخامس عشر کے نام سے کیا، مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کی ایک کتاب کا ترجمہ توزيع الثروة فی الإسلام کے نام سے کیا، مفسر قرآن مولانا امین اصلاحی کی ایک کتاب کا ترجمہ المنهج في الدعوة الى الإسلام کے نام سے کیا، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کی بھی ایک کتاب کا ترجمہ اسباب سعادة المسلمين وشائهم کے نام سے کیا۔

یہ تمام کتابیں متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ مجلہ "البعث الإسلامی" اور "الرائد" کے صفحات پر مختلف موضوعات کے تحت سیکڑوں ایسے وقیع اور جاندار مضامین ہیں جو انتظار میں بے قرار ہیں کہ ان کو یکجا کر کے کتابی شکل دی جائے اگر وہ سارے مضامین یکجا کر دئے جائیں تو بلا

مبالغہ دسیوں کتابیں تیار ہوجائیں، بے محابا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا عربی کے ان مایہ ناز ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے عربی نثر کی ہر رہ گذر پر اپنے فکر وفن کی شمعیں روشن کیں جن کی روشنی دیر اور دور تک اجالا کرتی رہے گی، خدا کرے کہ موصوف کے قلم کی شگفتگی قائم ودائم رہے تاکہ فکر اسلامی اور ادب برائے زندگی وکائنات کی معطر کلیاں سدا کھلتی رہیں۔

عربی زبان تو آپ کے کمالات کی معراج ہے تاہم اردو صحافت کے میدان میں بھی آپ کی کاوشیں قابل قدر ہیں، ندائے ملت اور تعمیر حیات کے صفحات اس پر گواہ ہیں، آپ کا ادبی مذاق اردو اور عربی زبانوں میں انتہائی پاکیزہ اور بلند ہے بلکہ مذاق سے بڑھ کر ادبی حس کی تعبیر زیادہ موزوں ہوگی، اسی ادبی حس کی کرشمہ سازی ہے کہ آپ کی کوئی تحریر ادبی حلاوت ولطافت سے خالی نہیں ہوتی، اردو، عربی کے ہزاروں اشعار نوک زبان ہیں، آپ کی علمی فتوحات کا دائرہ صرف ادب وصحافت ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ آپ دیگر اسلامی علوم کے اسرار ورموز سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص قرآن فہمی کا بڑا لطیف ذوق رکھتے ہیں۔

اردو زبان میں بھی آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اسوۂ حسنہ کے آئینہ میں، اسلام اجتماعیت اور اس کا ادب، تذکرہ اہل دل، علم التصریف،

آخر الذکر کتاب، فن صرف کے موضوع پر ہے جو دار العلوم ندوۃ العلماء کی نصابی ضرورت کو مدنظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے، مولانا نے علم صرف کے بنیادی قواعد کو بڑی وضاحت کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا ہے، یہ کتاب ندوۃ العلماء اور اس کی تمام شاخوں میں سوم عربی میں پڑھائی جاتی ہے، طالب علم اگر اس کتاب کو اچھی طرح پڑھ لے تو وہ صرف کی بڑی بڑی کتابوں سے مستغنی ہوسکتا ہے۔

ان کتابوں کے سوا تعمیر حیات ندائے ملت اور رضوان کے صفحات پر مولانا کے سیکڑوں مضامین بکھرے ہوئے ہیں، ضرورت ہے کہ ان مضامین کو یکجا کیا جائے تا کہ موجودہ اور آنے والی نسلیں مولانا کی اردو نگارشات سے واقف ہوسکیں۔

کہتے ہیں، ہیرے کی پرکھ جوہری جانے، حکومت ہند نے ۱۹۹۴ء میں مولانائے محترم کی عربی خدمات کے صلے میں صدر جمہوریہ ایوارڈ دے کر اپنی قدردانی وفراخدلی کا ثبوت پیش کیا، ۱۹۹۸ء میں شیخ محمد احمد پرتاپ گڑھی ایوارڈ سے آپ کو نوازا گیا، اسی سال لکھنؤ کی اسلامی کونسل کی جانب سے آپ کو قومی ایوارڈ دیا گیا، ۲۰۰۱ء میں عروس البلاد ممبئی کی سرزمین پر دینی خدمات کے اعتراف میں ہارون رشید علیگ کا یادگار ایوارڈ دے کر آپ کی قدر افزائی کی گئی، ملک وقوم کی جانب سے مولانا کی خدمت میں یہ خراج عقیدت وتحسین خود قوم

وملک کی شان ووقار کو بڑھاتی ہے کیونکہ مولانا عظمت وشہرت کے جس مقام بلند پر ہیں اس کے پیش نظر آپ کو ان تمام چیزوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے'' یا ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید''۔

مولانا اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود علمی، دعوتی اسفار بھی کرتے رہتے ہیں۔ اندرون ملک تو اسفار کا لامتناہی سلسلہ ہے بیرون ملک بھی آپ کے بہت سے اسفار قابل ذکر ہیں جیسے عراق، امارات، عمان، قطر، سعودیہ عربیہ، کویت، پاکستان، سنگاپور، بنگلہ دیش، وغیرہ، ۱۹۷۷ء میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی دعوت پر ازہر کے مہمان کی حیثیت سے استفادۂ علمی کے لئے مصر تشریف لے گئے۔

اتر پردیش کی دینی تعلیمی کونسل یوپی کے مسلمانوں کا ایک ایسا بورڈ ہے جس کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی تعلیم کی فکر کی جائے اور آزاد ہندوستان میں لادینی نظام تعلیم کا جو سیل رواں ہے اس کے سامنے ایسا باندہ باندھا جائے کہ جس سے مسلم بچوں کے دینی عقائد محفوظ رہیں۔ مولانا علی میاںؒ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم اس کونسل کے روح رواں تھے، یہ کونسل اپنی شاندار تاریخ رکھتی ہے اور بہت سے محاذوں پر اس نے نمایاں کامیابی بھی حاصل کی، مولانائے محترم نے اس دینی تعلیمی کونسل کے نائب صدر کے عہدے

کو محض اس بنیاد پر قبول کرلیا کہ یہ بھی ملت کی خدمت کا ایک نتیجہ خیز و نفع بخش اسٹیج ہے، اور ہندوستان میں جو لادینی نظام تعلیم رائج ہے اس کے سیلاب تند و تیز کو روکنے کا ایک طاقتور ہتھیار ہے۔ کیونکہ اگر اس سیلاب کو نہ روکا گیا تو ہماری نئی نسل کا اسلامی عقائد پر باقی رہنا بہت مشکل ہوجائے گا، کونسل کے جلسوں میں مولانا برابر شریک ہوتے ہیں اور مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔

خیر کا، دین کے فروغ کا، قوم کی فلاح و بہبود کا کوئی بھی کام ہو مولانا دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح حاضر، بھلائی کی ہر دعوت پر لبیک کہنے کے لئے مستعد، کوئی بتائے کہ خلوص اور دین کی سربلندی کی خاطر سب کچھ تج دینا اور کس کو کہیں گے۔

تمت بالخیر

فہرست

۱	پیش لفظ	۳
۲	ہندوستان میں عربی صحافت کا خورشید جہاں تاب	۱۱
۳	آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے حضر میں	۳۰